تحریک ندوۃ العلماء اور اس کا منہج و مسلک

محمد انس

عالیہ ثالثہ شریعہ

مدرسۃ العلوم الاسلامیہ، علی گڑھ

فہرستِ مضامین

حرفِ آغاز

بابِ اوّل:

تحریک ندوۃ العلماء کے قیام کا تاریخی پسِ منظر

- ۱۸۵۷ء کے بعد مسلمانوں کی تعلیمی صورت حال
- عیسائیت کی تبلیغ اور عیسائی مشنریوں کی جدوجہد
- برطانوی اقتدار کے دوررس اثرات
- قدیم عربی مدارس کی صورتِ حال
- صورتِ حال کی بحرانی اور دو قیادتیں
- دار العلوم دیوبند
- سرسید کا مکتبِ فکر
- قدیم وجدید کی کشمکش
- نصابِ تعلیم پر ایک نظر
- نزاعِ باہمی اور تکفیر و تفسیق کی گرم بازاری
- تحریکِ ندوۃ العلماء کی ضرورت

بابِ دوم:

ندوۃ العلماء کا تعارف

- مختصر رودادِ قیام
- علمائے حق کا اعتراف و تائید کلی
- تحریکِ ندوۃ العلماء کے مقاصد
- ندوۃ العلماء کی خصوصیات
- تحریکِ ندوۃ العلماء سے دار العلوم ندوۃ العلماء تک
- دار العلوم ندوۃ العلماء کے مقاصد
- دار العلوم ندوہ کی ایک خصوصیت
- ندوۃ العلماء کی فکری اساس

باب سوم:

تحریکِ ندوۃ العلماء کے چند اہم کارنامے

- نصابِ تعلیم کی اصلاح
  - قدیم نصاب کی خامیاں
  - جدید نصاب کی خوبیاں
- رفع نزاع باہمی کی کوشش
- عربی زبان وادب پر خصوصی اعتناء
- اسلامی لٹریچر کا ذخیرہ
- دینی واسلامی مکاتب ومدارس کا قیام

باب چہارم:

تحریکِ ندوۃ العلماء کا منہج ومسلک

- منہج ومسلک کی تعریف
- ندوۃ العلماء کا منہج
- ندوہ کا منہج-قدیم وجدید کی جامعیت
- درس وتدریس میں ندوہ کا منہج
- فنّ تفسیر میں تدریس کا منہج
- فنّ حدیث میں تدریس کا منہج
- فنّ فقہ میں تدریس کا منہج
- عربی زبان وادب میں ندوے کا منہج
- ندوۃ العلماء کا مسلک
- ندوۃ العلماء کا فقہی مسلک
- اختلافی مسائل میں راہِ اعتدال
- جدید عصری تقاضوں کی تکمیل کے لیے اجتہاد کی ضرورت اور ندوے کا موقف

حرفِ آخر

حواشی

مراجع ومصادر

حرفِ آغاز

۱۸۵۷ء کی جنگِ آزادی میں ناکامی کے بعد مسلمانوں میں مایوسی عام ہوگئی، مسلمان احساسِ کمتری کا شکار ہوئے، اس کا فائدہ اٹھاتے ہوئے عیسائی مشنریوں نے اپنی جدوجہد شروع کر دی اور عیسائیت کی خوب تبلیغ کی، آزادی میں ناکامی کے اثرات تعلیم میں حد درجہ اثر انداز ہوئے، عربی مدارس اپنے قدیم نصاب پر قائم تھے، تکفیر و تفسیق کی گرم بازاری تھی، مناظرے سے مجادلے اور مجادلے سے مقاتلے تک بات پہنچ چکی تھی، اس صورت حال میں دو قیادتیں ابھر کر سامنے آئیں۔ ایک نے قدیم صالح کی حد سے زیادہ حفاظت کی اور مغرب کو لے کر منفی رویّہ اختیار کیا۔ دوسری نے مغرب سے آنے والی ہر فکر کو بغیر کسی تنقید و ترمیم کے اختیار کیا، ان حالات میں ضرورت تھی ایک ایسی تحریک کی جو ان دونوں کے درمیان پل کا کام کرے اور جو قدیم صالح اور جدید نافع کی جامع ہو۔ چناں چہ اس وقت کے نبض شناس علما کے مشورے سے مدرسۂ فیض عام کے جلسۂ دستار بندی کے موقع پر علما نے اس تحریک کی بنیاد ڈالی، جس کو ہم اور آپ "ندوۃ العلماء" کے نام سے جانتے ہیں۔

ندوۃ العلماء نے حالات کے تقاضوں کو پورا کرنے میں حتی المقدور سعی کی، علما کے درمیان ربط و اتحاد پیدا کرنا، نصاب کی اصلاح کرنا، جدید نصاب کا اجرا کرنا، قدیم و جدید کے جامع علمائے کرام کو تیار کرنا، یہ ندوۃ العلماء کے مقاصد میں ابتدا سے شامل رہا ہے۔ ندوۃ العلماء نے ان مقاصد کی تکمیل کے لیے لکھنؤ میں دار العلوم کی بنیاد ڈالی اور اپنے مقاصد میں کافی حد تک کامیابی حاصل کی، ندوۃ العلماء نے اعتدال کا درس دیا، فروعی مسائل میں شدت کو ناپسند کیا، اس اعتبار سے ندوہ کا منہج و مسلک ہندوستان میں موجود دیگر مدارسِ عربیہ سے کافی حد تک منفرد اور ممتاز ہے۔

اسی عظیم الشان تحریک کے تعارف، اس کے پسِ منظر، اغراض و مقاصد، کارہائے نمایاں اور منہج و مسلک کو واضح کرنے کے لیے یہ سطور قلم بند کی ہیں۔

مقالے کی ترتیب کچھ اس طرح ہے کہ پہلے باب میں تحریک کے قیام کا پسِ منظر بیان کیا گیا ہے، جس میں اس وقت ملک و ملّت کے حالات پر نظر ڈالتے ہوئے قدیم عربی مدارس کی صورت حال کے تناظر میں ندوۃ العلماء کی ضرورت کو بیان کیا گیا ہے۔ دوسرے باب میں تحریک ندوۃ العلماء کا تعارف، تحریک کی مختصر رودادِ قیام، تحریک کے تحت دار العلوم کا قیام اور ندوۃ العلماء کی چند خصوصیات کو بیان کیا گیا ہے۔ تیسرے باب میں ندوۃ العلماء کے چند اہم کارناموں اور خدمات کو پیش کیا گیا ہے۔ آخری باب میں ندوۃ العلماء کے منہج و مسلک پر روشنی ڈالی گئی ہے، پھر اخیر میں حرفِ آخر کے طور پر ندوۃ العلماء کی عصری معنویت اور افادیت کو بیان کیا گیا ہے، امید ہے کہ اس سے کسی حد تک تحریکِ ندوہ کا تعارف، اس کے مسلک کی بنیاد اور اس کے منہج کی نوعیت سامنے آجائے گی۔

راقم الحروف: محمد انس

باب اوّل:

تحریک ندوۃ العلماء کا تاریخی پسِ منظر

۱۸۵۷ء کے بعد مسلمانوں کی تعلیمی صورتِ حال

۱۸۵۷ء کے بعد ملک میں جو ناگفتہ بہ حالات پیدا ہوئے، ان میں ایک یہ کہ نظامِ تعلیم بالکل پسپا ہو گیا، نظامِ تعلیم کی تباہی نے ملک میں جہالت کو عام کر دیا، حکومت کی زبان انگریزی قرار دے کر عربی اور فارسی کے تمام مکاتب کو ختم کر دیا گیا، اسکولوں اور کالجوں کا کورس وہ تجویز کیا گیا جو مسلمان بچوں کو عیسائی نہ بنائے تو کم از کم مسلمان نہ رہنے دے اور وہ اپنے مذہب کو لغو سمجھیں، انگریزوں نے جو نظامِ تعلیم اور جس نصاب کا جال ہندوستان میں پھیلایا وہ ان ہی کے الفاظ میں اس مقصد کے لیے تھا:

"ہمیں ایسی جماعت بنانی چاہیے جو ہم میں اور ہماری کروڑوں رعایا کے درمیان مترجم ہو اور یہ ایسی جماعت ہونی چاہیے جو خون اور رنگ کے اعتبار سے تو ہندوستانی ہوں مگر مذاق، رائے اور الفاظ و سمجھ کے اعتبار سے انگریز ہو"۔(۱)

عیسائیت کی تبلیغ اور عیسائی مشنریوں کی جدوجہد

ایک طرف تعلیمی نظام کی یہ پسپائی تھی پھر دوسری طرف عیسائی حکومت کے زیرِ سایہ پادریوں نے اس موقع کو غنیمت سمجھا اور اپنی مشنری طاقتوں کو آزمانا شروع کر دیا، عیسائی انجمنوں اور اداروں کی طرف سے پادری اور مشنری وفود ہندوستان آنے لگے، پادری اپنے مخصوص طرزِ تبلیغ میں لگ گئے، وہ برملا اپنی اس تمنّا کا اظہار کرتے تھے: "ہماری تمنا ہے کہ اس ملک میں ہندوستان کو گرجاؤں سے بھرا ہوا دیکھیں؛ چوں کہ ہم نے خود اس سے برکتیں حاصل کی ہیں، اس لیے ہم چاہتے ہیں کہ ان لوگوں کو بھی ان کے حاصل کرنے کی ترغیب دی جائے"۔

تاریخِ ندوہ کے مصنّف کے مطابق انیس سو عیسوی سے قبل ہی ایک اندازے کے مطابق ۴۲/ عیسائی مشن ہندوستان قائم ہو چکے تھے۔ عیسائیوں کے مختلف فرقوں نے باہمی رضامندی سے ہندوستان کو اپنے دین کی اشاعت کے لیے تقسیم کر لیا تھا: مثلاً پنجاب میں اسکاٹ لینڈ کا بریزی ٹرین چرچ، راجپوتانہ اور ہندوستانی ریاستوں میں آئرلینڈ کا رومن کیتھولک چرچ اور مغربی شمالی حصّے میں امریکہ کا میتھوڈیسٹ چرچ کے ڈھائی سو مشن ہندوستان کے مختلف شہروں میں پھیلے ہوئے تھے۔(۲)

برطانوی اقتدار کے دور رس اثرات

۱۸۵۷ء کی جنگِ آزادی میں ناکامی کے بعد مسلمانوں کے حوصلے پست ہو رہے تھے، ان کو شکست کا احساس ستا رہا تھا، احساسِ کمتری اور مایوسی عام ہو رہی تھی، ان کی عزت، خود داری پر کاری ضرب لگی تھی، ان کو نئے فاتح کا رعب، نئے حالات کی دہشت اور ناکامی کی شرم اور مختلف شکوک و شبہات کا سامنا تھا، ان کے سامنے قوت و خود اعتمادی سے لبریز فاتح قوم تھی، ایک ایسی تہذیب تھی جو جدت و نشاط انگیزی اور تخلیقی صلاحیتوں سے مالا مال تھی، اس طرح کے سینکڑوں مسائل تھے جو فوری اور دور اندیشانہ حل اور واضح موقف کے طلب گار تھے۔(۳)

قدیم عربی مدارس کی صورتِ حال

اس عہد پر نظر ڈالیے تو ایک طرف قدیم عربی مدارس اپنی تمام خصوصیات اور امتیازات کے ساتھ نظر آئیں گے، کتاب و سنت پر استقا

مت اور اسلاف کے طریقے پر پوری طرح گامزن تھے، نووارد مغربی تہذیب اور ہندوستانی سماج کے تصادم سے پیدا ہونے والے مسائل کی طرف ان کی توجہ بہت کم تھی، ان کے ذمہ دار (جن کا اخلاص شبہ سے بالاتر ہے) شاید یہ سوچتے تھے کہ آگے بڑھ کر دشمن کے حملے کو روکنے کے بجائے قلعہ بند ہو کر اپنی حفاظت کرنا زیادہ مفید ہے۔

اس طرزِ فکر کا اظہار نصابِ تعلیم میں اس طرح ہوا کہ درسِ نظامی بغیر کسی بنیادی تغیر کے وہی قدیم شکل پر برقرار رکھا گیا اور اس عہدِ انقلاب میں جو غالباً جدید تاریخِ انسانی کا سب سے تیز رفتار اور تغیر پذیر عہد ہے، اس میں سب سے کم تغیر قبول کیا گیا۔

اس زمانے میں (قیامِ ندوۃ العلماء کے وقت) جو نصابِ تعلیم بعض قدیم مرکزی مدارس میں قائم تھا، اس پر ایک نظر ڈالنے سے یہ بات ظاہر ہو جاتی ہے کہ طلبہ کے قیمتی اوقات کا کتنا بڑا حصّہ معقولات پر بلا ضرورت صرف ہو رہا تھا اور دینیات اور علمِ نافع کی طرف توجہ بہت کم تھی۔ (۴)

صورتِ حال کی بحرانی اور دو قیادتیں

اس پیچیدہ نفسیاتی کیفیت اور نازک حالت میں دو قسم کی قیادتیں ابھر کر سامنے آئیں۔ پہلی قیادت خالص دینی تھی، جس کے علَم بردار علمائے دین تھے۔ دوسری قیادت کے علَم بردار سر سید احمد خاں اور ان کے حلقہ بگوش اور جدید مکتبِ خیال کے افراد تھے۔(۵)

اس وقت علما نے اسلام کے دینی و علمی سرمایے کی حفاظت اور مسلمانوں کے دینی تعلق و احساس کو باقی رکھنے کے لیے ایسے دینی مدارس کا قیام ضروری سمجھا جو سیاسی زوال کے بعد مسلمانوں کو دینی و اخلاقی زوال سے محفوظ رکھیں اور ان میں ایسے علما تیار ہو کر نکلیں جو اسلامی شریعت و فقہ سے گہری واقفیت رکھتے ہوں اور ان میں داعیانہ روح اور رضاکارانہ خدمت و اشاعتِ علم کا جذبہ ہو اور حکومت کی اعانت و سرپرستی کے بغیر اس ملک میں مسلمانوں کی دینی خدمت اور رہنمائی اور علم کی اشاعت و حفاظت کا فریضہ انجام دے سکیں، ان مدارس میں دار العلوم دیوبند کو اوّلیت اور خاص اہمیت حاصل ہے۔(٦)

دار العلوم دیوبند

اس عظیم اصلاحی و تعلیمی تحریک کے بانی و سربراہ حضرت مولانا محمد قاسم نانوتویؒ تھے۔ حضرت نانوتویؒ ۱۸۵۷ء کے معرکے میں خود بھی شریک تھے اور مسلمانوں کی شکست کا زخم دل پر لیے ہوئے تھے، اس لیے انھوں نے ایک ایسے ادارے کا قیام ضروری سمجھا جس کے ذریعہ سیاسی زوال کے بعد مسلمانوں کو دینی و اخلاقی زوال سے بچایا جا سکے۔

مولانا محمود الحسن دیوبندیؒ فرماتے ہیں: "مدرسہ میرے سامنے قائم ہوا، جہاں تک میں جانتا ہوں ۱۸۵۷ء کی ناکامی کے بعد یہ ادارہ قائم کیا گیا؛ تاکہ کوئی ایسا مرکز قائم کیا جائے، جس کے زیرِ اثر لوگوں کو تیار کیا جائے؛ تاکہ ۱۸۵۷ء کی ناکامی کی تلافی کی جائے"۔(۷)

مولانا علی میاں ندویؒ دار العلوم کی خدمات پر روشنی ڈالتے ہوئے لکھتے ہیں: "ہندوستانی مسلمانوں کی دینی زندگی پر دار العلوم کے فضلا کی اصلاح، عقائد کی درستی، تبلیغِ دین اور فرقِ ضالّہ سے مناظرے میں جدوجہد لائقِ تحسین ہے۔ متعدد فضلا نے سیاسی میدان اور وطنِ عزیز کے دفاع کے سلسلے میں بھی کارہائے نمایاں انجام دیے اور حق گوئی و بے باکی میں علمائے سلف کی یاد تازہ کر دی۔ تمسک بالدین، مسلکِ احناف کی سختی سے پابندی، اسلاف کی روایات کی حفاظت اور سنت کی مدافعت دیوبند کا شعار رہا ہے۔(۸)

سر سیدؒ کا مکتبِ فکر

دوسری قیادت جس کے علم بردار سرسید احمد خاںؒ تھے۔ سرسید نے ۱۸۵۷ء کی ناکامی کو اپنی آنکھوں سے دیکھا اور اس کا ان کے دل و دماغ پر بڑا گہرا اثر پڑا اور انھوں نے سوچا کہ جب تک مسلمان انگریزی تعلیم حاصل نہیں کریں گے اور تہذیب و تمدن میں صاحبِ اقتدار طبقے کے تابع نہیں ہوں گے تو ان کا احساسِ کمتری دور نہ ہو گا، اسی تخیل اور مقاصد کی تکمیل کے لیے انھوں نے "محمڈن اینگلو اورینٹل کالج" قائم کیا۔

سرسید احمد خان کی تحریک نے جہاں ایک طرف مسلمانوں میں بڑھتی مایوسی اور احساسِ کمتری کو کسی حد تک دور کیا، وہیں دوسری طرف یہ تحریک پورے طور سے مغربی تہذیب اور اس کے رنگ میں رنگ گئی۔ مغربی تہذیب اور اس کی مادی بنیادوں کی تقلید اور جدید علوم کو اس کے عیوب و نقائص کے ساتھ بغیر کسی تنقید و ترمیم کے اختیار کیا۔

علامہ سید سلیمان ندویؒ سرسید کے نظریے پر روشنی ڈالتے ہوئے لکھتے ہیں: "مسلمانوں کی موجودہ بیماریوں کا علاج سرسید کے نزدیک یہ تھا کہ مسلمان مذہب کے سوا ہر چیز میں انگریز ہو جائیں" یعنی اس کا مقصد یہ تھا کہ عقیدہ تم حجاز سے لو اور عمل مغرب سے۔ ایمان کتابِ الٰہی اور سنت نبوی سے لو اور طرزِ فکر اور نظامِ زندگی فلسفۂ یورپ سے۔(۹)

قدیم و جدید کی کشمکش

غرض کہ دونوں مکاتبِ فکر نے الگ الگ انتہا پسند موقف اختیار کیے۔ پہلی قیادت جو خالص طبقۂ علما پر مشتمل تھی، انھوں نے مغربی فکر کے سدّباب کے لیے منفی رویّہ اختیار کیا اور مغرب سے استفادۂ علمی کو شجرِ ممنوعہ قرار دیا۔ اس کے بالکل برعکس دوسری قیادت جس کے علم بردار سرسید تھے وہ مغربی تہذیب کو بغیر کسی تنقید و ترمیم کے اختیار کر لینے کے پُرجوش داعی تھے۔

ان دونوں تحریکوں کا تجزیہ کرتے ہوئے مفکرِ اسلام حضرت مولانا سید ابو الحسن علی حسنی ندویؒ فرماتے ہیں: "قوم کا ایک بڑا حصّہ ان دونوں طبقوں کے درمیان ہچکولے کھا رہا تھا، جس میں سے ایک طبقہ قدیم طرزِ تعلیم سے سرمو انحراف، ایک قسم کی تحریف اور بدعت سمجھتا تھا۔ دوسرا طبقہ مغرب سے آنے والی ہر چیز کو عظمت و تقدیس کی نگاہ سے دیکھتا تھا اور اس کو ہر عیب و نقص سے پاک سمجھتا تھا؛ یہاں تک کہ اہلِ مغرب کے افکار اور فکری رجحان بھی اس کو عظمت و عصمت کا پیکر نظر آتے تھے اور ان کو وہ ذہنِ انسانی کی پرواز کی آخری منزل تصور کرتا تھا۔(۱۰)

نصابِ تعلیم پر ایک نظر

نصابِ تعلیم ہمیشہ تبدل و تغیر اور حذف و اضافے کی منزل سے گزرتا رہا ہے اور درست طریقہ بھی یہی ہے کہ ہر زمانے کے پیش آمدہ مسائل اور زمانے کے مقتضایات کے مطابق نصابِ تعلیم کو ڈھالا جائے؛ لیکن تعجب ہے کہ انیسویں صدی جس میں اس تغیر و تبدل کی غیر معمولی ضرورت تھی۔ یہ نصاب ایک منزل پر آکر ٹھہر گیا اور اس نے ہر تغیر و اضافے سے انکار کر دیا۔ فقہ و قانونِ اسلامی میں توسع و اضافہ، مسائل میں اجتہاد جو اپنے شرائط کے ساتھ علما کا فریضہ اور زمانے کی رہ نمائی کا ذریعہ تھا معطل ہو گیا۔ درسِ نظامی میں عرصے سے کوئی تبدیلی نہیں ہوئی۔

نزاعِ باہمی اور تکفیر و تفسیق کی گرم بازاری

نصابِ تعلیم میں جمود کا نتیجہ یہ ہوا کہ وہ صلاحیتیں جو صحیح رہ نمائی و تربیت اور مناسب استعمال سے بڑے مقاصد کے لیے بے حد مفید ثابت ہو سکتی تھیں، ایک دوسرے کی تکفیر، فروعی اختلافات، جماعتی عصبیت اور علمی طبقہ واریت کی نذر ہو کر رہ گئی۔

پوری امّت مقلدین اور غیر مقلدین میں تقسیم ہو گئی۔ اہلِ حدیث و اہلِ فقہ کے دو الگ الگ گروہ بن گئے اور ایک دوسرے سے اس طرح برسرِ پیکار ہوئے کہ گویا وہ دو مختلف مذاہب کے پیرو ہوں۔ ساری طاقت آمین بالجہر، قرأتِ فاتحہ اور رفع الیدین کے نقض یا اثبات پر صرف

کر دی گئی۔ فقہ کی جزئیات اور مختلف فیہ مسائل میں جن پر اسلام کی بقاو ترقی کا انحصار نہ تھا۔ ضخیم مناظرانہ کتابیں تیار ہونے لگیں۔ مناظرے ہوئے اور طنز و تعریض کا ایک لامتناہی سلسلہ شروع ہو گیا اور اس میں سخت تشدد و مبالغے سے کام لیا گیا، اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اہم ترین مسائل جن کا تعلق براہِ راست اسلام کے بقاو احیا اور مسلمانوں کے مستقبل سے تھا، غور کرنے کی فرصت باقی نہ رہی۔(۱۱) اسی زمانے میں حکیم سید عبدالحی حسنیؒ نے دہلی اور اس کے اطراف کا سفر کیا تھا، انھوں نے جو چشم دید صورتِ حال بیان کی ہے اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ اس وقت پورا ملک آپسی اختلاف کی کس قدر بھیانک آگ میں جل رہا تھا۔(۱۲)

تحریکِ ندوۃ العلماء کی ضرورت

یہ حالات تھے جو شدت سے اس بات کا تقاضا کر رہے تھے کہ علما اس مسئلے پر سنجیدگی سے غور کریں اور ایک ایسی انجمن کا قیام عمل میں لائیں، جو قدیم و جدید کی جامع ہو، ایک ایسا نصابِ تعلیم مجوّز کریں، جو بدلتے ہوئے حالات کا ساتھ دے۔ قدیم علوم کے ساتھ علومِ جدیدہ سے واقف ہوں اور یورپ کے اُفق سے اٹھتی ہوئی ملحدانہ خیالات کی گھٹاؤں کا پردہ چاک کریں اور جس انجمن سے ایسے جید علما تیار ہو کر نکلیں جو ایک طرف قرآن، حدیث، فقہ اور اصولِ فقہ میں ملکہ تام رکھتے ہوں تو دوسری طرف علومِ جدیدہ، فلسفۂ جدید، جدید علمِ کلام، سائنس اور انگریزی میں بھی خاصی صلاحیت رکھتے ہوں۔ اسی تخیل کے پیشِ نظر اس وقت کے نبض شناس علما نے ان مقاصد کی تکمیل کے لیے ضروری سمجھا کہ علما کی ایک انجمن کا قیام عمل میں لایا جائے اور اسی انجمن کو ہم "ندوۃ العلماء" کے نام سے جانتے ہیں۔

باب دوم:

ندوۃ العلماء کا تعارف

مختصر رودادِ قیام

۱۳۱۰ھ مطابق ۱۸۹۲ء میں مدرسۂ فیض عام کانپور کے جلسۂ دستار بندی کے موقع پر علما کی ایک مجلس مشاورت نے اتفاق رائے سے یہ بات طے کی کہ علما کی ایک مستقل انجمن قائم کی جائے اور آئندہ سال دستار بندی کے موقع پر اس کا پہلا عام جلسہ منعقد کیا جائے اور ہندوستان کے تمام ممتاز علما کو اس میں شرکت کی دعوت دی جائے۔

روداد ندوۃ العلماء ۱۳۱۱ھ بابت سال اوّل حصّہ اوّل میں مولانا محمد علی اس ابتدائی اور بنیادی جلسہ کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"۱۳۱۰ھ میں جب بہت سے نامور علما مدرسہ فیض عام کانپور کے جلسۂ دستار بندی میں رونق افروز ہوئے، اس وقت بعض دور اندیش علما نے تحریک کی کہ ایک انجمن علما کی قائم کی جائے؛ تاکہ جو خرابیاں مسلمانوں میں خصوصاً ان کی تعلیم میں واقع ہو گئی ہیں، ان پر غور کرے اور علما میں اتحاد پیدا ہو، اس تحریک کو تمام علما موجودین نے پسند فرمایا اور اس وقت آئندہ کاروائی کرنے کی غرض سے عہدہ دار بھی منتخب ہوئے"۔

اس مجلس میں انجمن کا نام "ندوۃ العلماء" تجویز ہوا اور مولانا سید محمد علی مونگیریؒ اس کے ناظمِ اوّل مقرر ہوئے، اور ان سب حضرات نے جو شریکِ جلسہ تھے اس اسکیم پر تائیدی دست خط کیے۔(۱۳)

ندوۃ العلماء کا تخیل سب سے پہلے کس کے ذہن میں آیا، اس کے متعلق سب سے مستند قول مولانا حبیب الرحمٰن خاں شروانیؒ کا ہے۔ وہ مولانا سید محمد علی مونگیریؒ کے صاحب زادہ مولانا لطف اللہ مرحوم کو ایک خط میں لکھتے ہیں:

".... ندوۃ العلماء کے قیام کا تخیل اولاً موصوف ہی کے دماغ میں پیدا ہوا تھا، جس پر سارے ملک نے لبیک کہا، آج اس کے آثار ملک و ملّت کے سامنے ہیں"۔(۱۴)

علما کا حق کا اعتراف و تائید کلّی

تحریک ندوۃ العلماء کا قیام ہوا تو اہلِ حق نے کھلے دل اعتراف کیا اور کلّی تائید کی، اس سلسلے میں سب سے بڑھ کر شہادت حضرت حاجی امداد اللہ مہاجرؒ کی وہ مکمل تائید و حمایت ہے، جو ندوہ کو اپنے آغاز و قیام سے ان کی وفات تک حاصل رہی، وہ اس کے حالات سننے کے لیے ہمیشہ مشتاق رہتے تھے اور اگر کبھی خط پہنچنے میں دیر ہوتی تھی تو خود پیش قدمی فرماتے تھے۔

ان کے الفاظ تحریک ندوۃ العلماء کے لیے سند تصدیق اور پیش گوئی اور بشارت کا درجہ رکھتے ہیں:

"مسلمانوں کی خوش قسمتی ہے کہ تین سال سے اس قسم کا جلسہ ہندوستان میں قائم ہوا ہے، جن کے تین جلسے بمقام کانپور، لکھنؤ، بریلی، بڑی شان و شوکت سے ہوئے، علاوہ ہزارہا مسلمانوں کے صدہا علما و مشائخ دور دور سے آکر شریک ہوئے۔ در حقیقت یہ تائید غیبی ہے، پروردگار عالم نے بفحوائے إذا أراد الله شيئاً هيأ أسبابه کے مجلس ندوۃ العلماء کو اصلاحی و ترقی اہل اسلام کے واسطے اس آخر زمانہ میں بطور لطیفہ غیبی ظاہر فرما دیا۔ ندوۃ العلماء کو مسلمانوں کے حق میں امداد غیبی سمجھنا چاہیے اور مسلمانوں کو خلوص کے ساتھ اس میں دامے، درمے، قدمے، سخنے شرکت و اعانت کرنی چاہیے۔(۱۵)

تحریک ندوۃ العلماء کے مقاصد

ابتدا میں تحریک کے دو مقاصد تھے:

۱- نصاب کی اصلاح: اس میں دو مقصد پیشِ نظر تھے، ایک یہ کہ ہر فن کے اہلِ کمال پیدا ہوں، جس کے ذریعہ درجۂ تکمیل قائم کرنا تھا۔ دوسرے جدید ضرورتوں سے باخبر علما کا پیدا کرنا جس کے لیے انگریزی زبان دانی اور علومِ جدیدہ کی تعلیم بھی ضروری تھی، اس بنا پر یہ دو امور دار العلوم کی تعلیم میں اصل الاصول ہیں، ورنہ مدارسِ قدیمہ پہلے سے موجود تھے۔

۲- دوسرا مقصد رفع نزاع تھا، یعنی باہمی تعصبات کا کم کرنا اور مقاصد مشترکہ میں تمام فرقہ ہائے اسلام کا مل کر کام کرنا۔ مثلاً اشاعتِ اسلام وغیرہ۔(۱۶)

لیکن جوں جوں تحریک ندوۃ العلماء آگے بڑھتی رہی، اس کے دائرہ کار اور بنیادی مقاصد میں اضافہ ہوتا رہا، اب گویا مندرجہ ذیل چار مقاصد تحریک ندوۃ العلماء کے بنیادی مقاصد قرار پائے۔

(۱) علومِ اسلامیہ کے نصابِ درس میں بنیادی اصطلاحات اور ہر دور میں تمدنی حالات کے تقاضے کے مطابق نئے نصاب کی تیاری۔

(۲) ایسے علما تیار کرنا جو کتاب وسنت کے وسیع وعمیق علم کے ساتھ جدید حالات سے بخوبی واقف اور زمانہ کے نبض شناس ہوں۔

(۳) اتحاد ملّی اور اخوتِ اسلامی کے جذبات کو فروغ دینا اور باہمی نزاع ختم کرنا۔

(۴) اسلامی تعلیمات کی اشاعت بالخصوص برادرانِ وطن کو اس کی خوبیوں سے واقف کرانا۔(۱۷)

ندوۃ العلماء کی خصوصیات

- مغربی افکار کا علمی و تحقیقی مقابلہ
- الجمع بین القدیم الصالح والجدید النافع
- الی الاسلام من جدید
- اصول ومقاصد میں تصلب اور فروغ ومسائل میں توسع
- رفع نزاع باہمی
- قرآن وعلومِ قرآن سے حد درجہ اعتناء
- ادب عربی کا صاف ستھرا ذوق
- تطبیق قواعد اور انشاء نگاری پر زور
- انگریزی زبان کی تعلیم
- علومِ جدیدہ کو داخل کرنے کی کوشش
- تحقیق وتالیف کی تربیت
- تاریخ وسیر سے خصوصی دل چسپی

تحریکِ ندوۃ العلماء سے دار العلوم ندوۃ العلماء تک

۱۳۱۵ھ مطابق ۱۸۹۷ء تک ندوۃ العلماء کا مرکزی دفتر کانپور میں ہی تھا۔ پانچویں اجلاس عام (جو شوال ۱۳۱۵ھ مارچ ۱۸۹۸ء بمقام کانپور منعقد ہوا) میں کثرت سے رائے آئی کہ لکھنؤ میں دار العلوم قائم ہو۔ یہ رائے منظور ہوئی، پھر اس فیصلہ کے بعد کہ دار العلوم کو لکھنؤ میں کھلنا ہے اور اس کے افتتاح کے لیے عارضی مکان بھی خرید لیا گیا۔ ۱۵/ ربیع الثانی ۱۳۱۶ھ مطابق ۲/ ستمبر ۱۸۹۸ء کو دفتر کانپور سے لکھنؤ میں منتقل ہو گیا اور اس کے بعد ۹/ جمادی الاخری ۱۳۱۶ھ مطابق ۲۶/ ستمبر ۱۸۹۸ء کو خاتون منزل گولہ گنج میں دار العلوم کا عملی افتتاح ہو گیا اور اس کے ابتدائی درجات کھل گئے۔ (۱۸)

دار العلوم ندوۃ العلماء کے مقاصد

(۱) علوم وفنون کی تکمیل۔

(۲) علومِ دینیہ خصوصاً علمِ کلام میں جس کی اس وقت نہایت ضرورت ہے، اعلیٰ درجے کا کمال پیدا کرنا؛ تاکہ دہریت اور الحاد کا پوری قوت سے مقابلہ کیا جاسکے، علم فقہ میں تبحر پیدا کرنا؛ تاکہ عبادات و معاملات میں ان کے فتاویٰ مستند اور واجب العمل ہوں۔

(۳) مسلمانوں میں اسلامی اخلاق اور شائستگی پیدا کرنا اور ان کو عمدہ اطوار اور عادتوں کا خوگر بنانا؛ کیوں کہ حقیقی اصلاح اس وقت تک ناممکن ہے، جب تک ہم اپنے اسلاف کی عادتوں کو اختیار نہ کریں۔

(۴) طلبہ میں عالی ظرفی و فراخ حوصلگی پیدا کرنا، جو بغیر اس قسم کے دار العلوم کے جس میں تمام باتیں شان و شوکت کے ساتھ ہوں اور طلبہ کو پست حوصلگی اور بے توقیری کے ساتھ بسر اوقات کرنے سے مستغنی کر دیا جاوے، حاصل نہیں ہو سکتی۔ (۱۹)

دار العلوم ندوۃ العلماء کی ایک خصوصیت

دار العلوم ندوہ کی ایک عجیب خصوصیت یہ ہے کہ اس میں دو ثلث کے قریب وہ طلبہ ہیں جو اپنے مصارف کے آپ متکفل ہیں، اس واقعہ سے متعدد امور ثابت ہوتے ہیں:

- یہاں کی عربی تعلیم میں کچھ ایسی خصوصیت ہے کہ دولت مند اور خوش حال لوگ بھی اس کو بے کار نہیں سمجھتے۔
- یہاں کے دار الاقامہ میں ذی وجاہت لوگ بھی اپنی اولاد کا بھیجنا گوارا کرتے ہیں۔
- دار العلوم سے بہت بڑا فائدہ یہ متوقع ہے کہ دولت مند گروہ میں بھی عربی اور مذہبی تعلیم بقدر ضرورت رواج پائے۔ (۲۰)

ندوۃ العلماء کی فکری اساس

مولانا ابو الحسن علی ندویؒ اپنے والد حکیم سید عبد الحیؒ کے ندوہ کی تحریک سے انجذاب اور کشش کے متعدد اسباب نقل کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

- اس تحریک کی اساس (علی گڑھ کی تعلیم جدید اور تہذیب مغرب کی دعوت اور ملک کی دوسری تحریکوں کے برخلاف) خالص دینی تھی،

یعنی اس میں مسلمانوں کے تنزل کا اصلی سبب دین سے انحراف اور صحیح دینی تعلیم سے محرومی قرار دیا گیا تھا اور اسی کو ملّت کے درد کا مداوا اور اصلاح و ترقی کا واحد راستہ تسلیم کیا گیا تھا۔

- اس تحریک میں علما کو مرکزی مقام دیا گیا ہے اور اسی کو امّت کی تعمیر و تخریب، ترقی و منزل اور اصلاح و فساد کا اصل ذمہ دار قرار دے کر اپنی دعوت و جدوجہد کا مرکز بنایا گیا ہے کہ امت میں اصلاحِ حال کی کوئی کوشش حقیقی طور پر اس وقت تک کامیاب نہیں ہو سکتی، جب تک علما اس کے داعی اور علم بردار نہ بنیں اور ان میں امت کی رہ نمائی و قیادت کی صلاحیت پیدا نہ ہو، اس کے لیے ایک طرف دینی علوم پر حاوی اور کتاب و سنت کا رمز شناس ہونے کی ضرورت ہے، دوسری طرف حالات زمانہ اور جدید ضرورتوں سے واقفیت کی۔
- اس تحریک کا بنیادی مقصد رفع نزاع باہمی تھا، جس کا تعلق سب سے پہلے علما کے مذہبی و فقہی نزاعات و اختلافات سے تھا، جس نے علمی تحقیق و مباحثہ سے آگے بڑھ کر مجادلے اور مجادلے سے بڑھ کر مقاتلے، عدالتی چارہ جوئیوں، فوج داریوں اور باہمی تذلیل و تضلیل بلکہ تکفیر و تفسیق کی شکل اختیار کر لی تھی اور سارا ہندوستان اس کی وجہ سے ایک مذہبی دنگل بنا ہوا تھا۔
- اس تحریک کا مزاج (سیاسی و ہنگامی کے بجائے) علمی و فکری تھا۔
- ندوۃ العلماء کی تحریک کا آغاز ہی اصلاح و ترقیٔ نصاب کے کام سے ہوا تھا۔
- علماء کا زمانہ کی ضرورتوں سے ناواقف ہونے کے سبب ندوۃ العلماء نے تدبیر اختیار کی کہ "انگریزی زبان اور بقدر ضرورت جدید علوم کو نصاب میں داخل کیا جائے اور ان کو دینیات اور عربی علوم و فنون کے ساتھ پڑھایا جائے"۔(۲۱)

باب سوم:

تحریکِ ندوۃ العلماء کے چند اہم کارنامے

- **رفع نزاع باہمی کی کوشش:**

انیسویں صدی میں باہمی اختلافات، مسلکی انتشار جس حد تک عبور کر چکے تھے، ندوہ کے دور اندیش بانیوں نے ان تمام مکاتبِ فکر کو جوڑنے کی کوشش کی، بلا تمیز مسلک و مذہب تمام لوگوں کو اتحاد کی دعوت دی اور تحریک ندوہ کا سب سے بڑا فائدہ یہ ہوا کہ علماء ساتھ مل بیٹھنے لگے، اتحاد ملّی کی اس کوشش میں اربابِ ندوہ نے حتی المقدور کوشش کی۔

- **نصابِ تعلیم کی اصلاح:**

تحریک ندوۃ العلماء کے دور اندیش بانیوں نے جن عظیم مقاصد کے لیے ندوۃ العلماء کی داغ بیل ڈالی تھی، ان میں سرِ فہرست قدیم نصاب تعلیم کی اصلاح کی تجویز تھی اور جدید نصاب کے اجراء کی کوشش تھی۔

قدیم نصاب کی خامیاں:

- منطق کی کتابیں ضرورت سے بہت زیادہ تھیں، صرف منطق کی پندرہ کتابیں نصاب میں شامل تھیں، تفسیر، حدیث، فقہ، اصولِ فقہ ان تمام علوم کی مجموعی کتابیں بھی مل کر تعداد میں ان کے برابر نہیں ہو سکتیں۔
- منطق کی پندرہ کتابیں اور تفسیر کی صرف دو کتابیں شاملِ نصاب تھیں؛ بیضاوی اور جلالین۔ بیضاوی کے صرف ڈھائی پارے اور جلالین پوری پڑھائی جاتی تھی۔(۲۲)
- جغرافیہ، تاریخ، علم اعجاز القرآن اور دیگر اہم علوم کی جس سے ذہن میں فکر و وسعت اور خیال میں بلندی پیدا ہوتی ہے، ایک کتاب بھی شاملِ نصاب نہ تھی؛ حالاں کہ یہ علوم طالب علم کے اندر ایسی صلاحیت پیدا کرتے ہیں، جس کی وجہ سے وہ خود اپنی ذات اور اپنے معاشرے کے تئیں مفید ہوتا ہے اور ضروریاتِ زمانہ کی تکمیل پر قادر ہوتا ہے۔(۲۳)
- ایک بڑا نقص یہ کہ ادب و عربیت کا حصّہ بہت کم شامل تھا، حالاں کہ یہ امر یقینی ہے کہ ادب و عربیت کے بغیر تفسیر و حدیث کسی میں کمال پیدا نہیں ہو سکتا، اس بنا پر ادب سے بے اعتنائی در حقیقت علوم دینیہ سے بے اعتنائی ہے۔(۲۴)
- ایک بڑا نقص یہ تھا کہ جو علوم مقصود بالعرض ہیں، ان کو مقصود بالذات بنالیا گیا اور زمانہ تحصیل کا بڑا حصہ انھیں کے حاصل کرنے میں صرف کر دیا جاتا۔ مثلاً نحو، صرف، منطق مقصود بالعرض ہیں؛ لیکن کتبِ درسیہ زیادہ تر انھی فنون سے متعلق تھیں۔(۲۵)
- اکثر کتابیں جو درس میں تھیں، ان میں مسائل کو اس طرح صاف اور منقح نہیں لکھا گیا کہ اصلی مسائل ذہن نشین ہو جائیں، رد و قدح، اعتراض و جواب، احتمالات اور تعلیلات سے مسائل کو مغلق اور پراگندہ کر دیا گیا جس سے طالب علم گویا ایک جال

میں پھنس کر رہ جاتا ہے۔

- علومِ جدیدہ کی کوئی کتاب درس میں داخل نہیں تھی۔
- انگریزی زبان درس میں داخل نہیں تھی۔(۲۶)
- نصاب کے علاوہ طرزِ تعلیم کو دیکھا جائے تو اس کا سب سے بڑا نقص یہ تھا کہ اصل فن کے بجائے کتاب کے ساتھ زیادہ اعتنا کی جاتی تھی، اصل مسئلہ کی تحقیق کے بجائے زیادہ وقت اس امر میں صرف کیا جاتا کہ وہ مسئلہ کس عبارت میں بیان کیا گیا ہے؟(۲۷)

جدید نصاب کی خوبیاں

- معقولات کا حصہ کم کیا گیا یعنی منطق فلسفہ کی کتابیں کم کی گئیں اور جو علوم مقصود بالذات ہیں ان پر توجہ زیادہ دی گئی۔
- قرآن وعلوم قرآن پر توجہ زیادہ دی گئی، تفسیرِ بیضاوی کے پندرہ پارے درس میں داخل کیے گئے۔
- عربی زبان وادب جو کتاب وسنت کے فہم کے لیے کلید کی حیثیت رکھتی ہے، اس پر خصوصی توجہ دی گئی اور از سرِ نو نصاب مرتب کیا گیا۔
- علومِ جدیدہ کو نصاب میں شامل کیا گیا۔
- انگریزی زبان کو ضروری قرار دیا گیا۔(۲۸)
- اسرارِ شریعت میں حجۃ اللہ البالغۃ نصاب میں رکھی گئی۔(۲۹)

پھر نصابِ تعلیم کی یہی تحریک عربی مدارس کے لیے نسخۂ کیمیا اور ان کی ترقی میں سنگِ میل ثابت ہوئی، اس کے بعد ہی مدارسِ عربیہ کے ذمہ داروں نے قدیم رائج نصاب کی طرف توجہ دی اور اس میں مناسب تبدیلیاں کیں، سینکڑوں مدارس وجامعات نے ندوۃ العلماء کے جدید نصاب کو اپنایا یا اس کے نقش پر اپنا نیا نصاب تیار کیا۔

- **عربی زبان وادب پر خصوصی اعتنا**

ندوہ نے عربی زبان وادب کی ضرورت کو شروع سے محسوس کیا اور عربی زبان کی تعلیم زندہ اور عصری زبان کی حیثیت سے دینے کے لیے ایک نیا نصاب تیار کیا، جس میں پہلے زبان سکھانے کا اہتمام کیا گیا اور عربی میں تعلیم کا بھی نظم کیا گیا، جدید ادب کی کتابیں اور جدید اہلِ قلم سے واقفیت کے لیے تاریخ ادب اور نقد کے موضوعات بھی نصاب میں شامل کیے گئے۔(۳۰)

- **اسلامی لٹریچر کا ذخیرہ**

تحریکِ ندوہ کے بعض قائدین نے بعض اوقات تنہا وہ خدمت انجام دی جو ایک پوری اکیڈمی کا کام ہے، انھوں نے اسلامی لٹریچر کا علمی و تحقیقی انداز میں ایک وسیع ذخیرہ فراہم کیا۔

مستشرقین کے اٹھائے ہوئے مسائل کا جواب دینے کے لیے علّامہ شبلیؒ نے "سیرۃ النبی"، "الجزیۃ فی الاسلام"، "حقوق الذمیین"، "کتب خانہ اسکندریہ"، "اورنگ زیب عالمگیر پر تاریخی نظر" تحریر کیں۔ مزید الفاروق، المامون، الغزالی، سوانح مولانا رومؒ، علامہ سید سلیمان ندویؒ کی تاریخ ارض القرآن، عربوں کی جہاز رانی، سیرت عائشہؓ، مولانا عبد الباریؒ کی مذہب و سائنس، مولانا عبد الحیؒ کی نزہۃ الخواطر، مولانا علی میاں کی ماذا خسر العالم بانحطاط المسلمین وغیرہ سینکڑوں کتابیں ہیں جو اربابِ ندوہ کی تحقیق کا شاہ کار ہیں۔

- **دینی و اسلامی مکاتب و مدارس کا قیام**

ندوۃ العلماء کے فضلا نے ہندوستان کے مختلف علاقوں میں دینی و اسلامی مدارس و مکاتب کا جال پھیلا دیا ہے، یہ سارے مدارس ندوہ کے نصاب و نظام تعلیم کے مطابق کام کر رہے ہیں، اس طرح ندوہ کا کام و پیغام پورے ملک میں عام ہو گیا۔ شہر کے اندر مکاتب کے علاوہ ملک کے طول و عرض میں ندوۃ العلماء کے مدارسِ ملحقہ کی تعداد ۱۸۴ ہے اور مزید درخواستیں زیرِ غور ہیں۔ یہ ندوۃ العلماء کی رفتار ترقی اور اس کے نصاب و نظامِ تعلیم و تربیت کی مقبولیت کی بڑی دلیل ہے۔(۳۱)

باب چہارم:

تحریک ندوۃ العلماء کا منہج و مسلک

منہج و مَسلک کی تعریف

"منہج" عربی لفظ ہے جس کے معنی ہیں "طریقۂ کار"، "منصوبہ بندی"، اسی سے ایک دوسرا لفظ "منہاج" اسی معنی کے لیے آتا ہے جس کو قرآن نے بھی استعمال کیا ہے: لِكُلٍّ جَعَلْنَا مِنكُمْ شِرْعَةً وَّمِنْهَاجًا۔ (المائدہ:۴۸)

منہج کسی بھی علمی یا عملی کام کو انجام دینے کے لیے اختیار کیے گئے اصولوں اور مراحل کی وضاحت کرتا ہے، یہ اوّل تو علم کی وضاحت کرتا ہے اور اس سے آگے کی بات یہ ہے کہ منہج کے ذریعہ علم کا نظام درست ہونے کے ساتھ اس کا میدان کشادہ ہو جاتا ہے، منہج انسانی فکر کو ایک محور پر مرکوز کر دیتا ہے، جس کے ذریعہ انسانی فکر کسی بھی شے کو مکمل شرح و بسط، نئے تسلسل اور نمایاں اسلوب میں بیان کرنے کی پابند ہو جاتی ہے، کسی بھی جماعت، تنظیم اور انسان کے افکار و نظریات کا جو رخ ہے اسے فکری منہج سے تعبیر کیا جاتا ہے۔

"مسلک" بھی عربی لفظ ہے، اس کے لغوی معنی راہ، راستہ اور چلنے کی جگہ کے ہیں، اصطلاح میں مسلک، نظریہ و مکتبۂ فکر کو کہا جاتا ہے، کسی تنظیم، جماعت یا تحریک کا مَسلک اس کی اَساس اور بنیاد ہوتا ہے کہ وہ جماعت یا تحریک کس فکر پر قائم ہے اور کن بنیادوں پر وہ اپنے علمی و عملی میدان میں سرگرم ہے۔

ندوۃ العلماء کا منہج

ندوۃ العلماء کے منہج پر روشنی ڈالتے ہوئے علامہ سید سلیمان ندویؒ رقمطراز ہیں: "ملک میں قدیم و جدید تعلیم یافتوں کی دو برابر کی جماعتیں قائم ہیں، ہمارا کام ان دونوں کے درمیان اتصال پیدا کرنا ہے فریق اوّل سے کہنا ہے کہ تم علوم قدیم کے حرم اقدس کی توہین کرتے ہو، جدید فرقہ الزام دیتا ہے کہ پرانے علوم کو زندہ کر کے تم ہمارے پاؤں میں پھر وہی زنجیریں ڈالنا چاہتے ہو، جن کو پچاس برس کی محنت میں ہم نے بڑی مشکل سے کاٹا ہے، حقیقتِ حال پر نظر ہو تو دونوں پر اپنی غلطی آپ منکشف ہو جائے۔ یورپ کے علوم، قدیم علوم کی معصومیت میں رخنہ انداز ہیں بلکہ اس کے حسن و جمال کی افزائش کا سامان ہیں، دوسرے فریق سے کہنا ہے کہ اسلاف کے متروکہ علوم کو ذرا صیقل کر کے دیکھو! زنجیر پا نہیں، تمہارے پائے کمال کا خلخال ہے، ورنہ سچ یہ ہے کہ تم یورپ کے دیس میں غریب و نادار والدین کی وہ بیٹی ہو جو صرف سسرال کی دولت پر نازاں ہے۔" (۳۲)

ندوے کا منہج ــــ قدیم و جدید کی جامعیت

ندوۃ العلماء کا منہج قدیم اور جدید دونوں کا سنگم ہے، وہ اسلامی تعلیم اور اسلامی فکر کا ایک جامع منہج ہے اور میدانِ فکر و عمل میں وہ قدیم و جدید کی اسی جامعیت کو اپنے پیش نظر رکھتا ہے، الجمع بین القدیم الصالح والجدید النافع کے وسیع تصور پر اس کی بنیاد ہے، اصول میں تصلب اور فروع میں توسع کو پسند کرتا ہے، اور فروعی اختلافات میں تسامح سے کام لینے کو بہتر سمجھتا ہے، یہ ندوۃ العلماء کا بڑی ہی وسعتِ فکری کا حامل منہج ہے، جس کی وجہ سے وہ ملک میں موجود دیگر مدارسِ اسلامیہ سے ممتاز ہے، اور اسی نہج پر وہ اپنے طلبہ کی تربیت کرتا ہے، جس کا نتیجہ ہے کہ یہاں سے فارغ ہونے والے قدیم اور جدید دونوں علوم کے جامع ہوتے ہیں اور منہجِ اعتدال ان کا اہم وصف ہوتا ہے۔

درس و تدریس میں ندوے کا منہج

دار العلوم میں درس و تدریس کا جو طریقہ اختیار کیا گیا، اس میں اس کا خاص خیال رکھا گیا کہ اساتذہ کا وقت عبارت فہمی میں ضائع نہ ہو بلکہ اصل فن کی طرف پوری توجہ دی جائے اور قدیم طریقہ کے مطابق کتاب حل کروائی جائے؛ تاکہ اس کے بعد اس فن کی باریکیاں بیان کر سکیں اور اس طرح طلبہ کو متعلقہ فن سے پوری واقفیت ہو سکے۔

دار العلوم میں فنون کے لحاظ سے درس و تدریس کے مختلف طریقے رائج ہیں، اس لیے ہر فن کے اعتبار سے طرز تدریس کی مختصر وضاحت کی جاتی ہے۔

فنّ تفسیر میں تدریس کا منہج

فن تفسیر میں تدریس کا یہ طریقہ اختیار کیا گیا ہے کہ اولاً پورے قرآن شریف کا متن پڑھایا جائے، یعنی پورے کلام مجید کا درس اس انداز سے ہو کہ طلبہ کے سامنے صرف قرآن پاک کا نسخہ رہے اور اساتذہ اصل مراجع سے تیاری کر کے آئیں اور متعلقہ آیات کے بارے میں مفسرین نے جو کچھ تحریر کیا ہے اس کا خلاصہ سامنے آجائے اور اس کا اصل مقصد و حقیقی مفہوم واضح ہو جائے، اس طرح تین چار سالوں میں جب پورا قرآن ختم ہو جائے تو تفسیر کی قدیم اور بنیادی کتابیں مثلاً: بیضاوی شریف، جلالین، کشّاف وغیرہ سبقاً سبقاً پڑھائی جاتی ہیں، تاکہ طلبہ قدیم مفسرین کے اسلوب اور مختلف مفسرین کے نقطہ ہائے نظر سے واقف ہو جائیں۔

فنّ حدیث میں تدریس کا منہج

حدیث کے باب میں ندوۃ العلماء کا منہج تدریس یہ ہے کہ احادیث کی کتابیں فن کی حیثیت سے پڑھائی جاتی ہیں یعنی حدیث کے مفہوم و مراد کی وضاحت کے بعد جو فنی چیزیں ہیں۔ مثلاً رواۃ، سند متن، روایت کی حیثیت اور درایت وغیرہ اس پر اصل توجہ دی جاتی ہے اور اس کے بعد اگر مذکورہ روایات سے کوئی فقہی مسئلہ مستنبط ہوتا ہے تو اس کی وضاحت بھی کی جاتی ہے اور اس بات کا بھی لحاظ کیا جاتا ہے کہ مسائل کے استخراج و استنباط میں قرآن و سنت کی روح پیش نظر ہو اور اس کا پورا احتیاط کیا جاتا ہے تاکہ مسلکی تفوق ثابت کرنے کی کوشش میں روح حدیث مجروح نہ ہو۔ ندوۃ العلماء کے نصاب میں احادیث کو جس ترتیب سے شامل کیا گیا ہے اس میں طلبہ کی ذہنی و نفسیاتی تربیت کو مد نظر رکھا گیا ہے جس کی ترتیب یہ ہے: تہذیب الاخلاق، ریاض الصالحین، مشکاۃ المصابیح، موطأ امام مالک، ترمذی، (مکمل) سنن ابی داؤد، صحیح مسلم، صحیح البخاری (منتخب ابواب)، ابن ماجہ (منتخب ابواب) اور حدیث پاک کے ساتھ منتخب ابواب وغیرہ۔ حدیث پاک کے ساتھ ساتھ علوم حدیث کی کتابیں بھی پڑھائی جاتی ہیں۔ مثلاً: مبادی اصول حدیث، مقدمۃ الشیخ عبد الحق دہلوی، نخبۃ الفکر وغیرہ۔

فنّ فقہ میں تدریس کا منہج

فقہی کتابوں کی تدریس میں طریقۂ کار اور منہج یہ ہے کہ پہلے نفس مسئلہ کی وضاحت کی جائے، پھر اس میں جتنے مسالک ہیں ان کو مع دلائل واضح کیا جائے، ان سبھی کے دلائل پر ناقدانہ نظر ڈالتے ہوئے مستدلات کو اصول کی روشنی میں پرکھا جائے، اس کے بعد احناف کے ترجیحی دلائل بیان کیے جائیں اور اس سلسلے میں دیگر مسالک کے ساتھ تضحیک و استہزاء کا رویہ نہ اختیار کیا جائے، بلکہ اگر کہیں احناف کا مسلک دلائل کی روشنی میں کمزور ہے تو اس کی نشاندہی کی جائے۔

ان تینوں فنون کے ساتھ اصول و قواعد کی کتابیں بھی پڑھائی جاتی ہیں اور ان کے مسائل کو خاص طور پر مستحضر کرایا جاتا ہے، علیا کے

درجوں میں فقہ واصول فقہ کی ساری کتابیں اس طرح پڑھائی جاتی ہیں کہ طلبہ خود ہی متعلقہ کتاب کا مطالعہ دیکھ کر آتے ہیں اور کلاس میں استاذ کی موجودگی میں اس کا درس پیش کرتے ہیں، پھر جہاں جہاں طلبہ کو سمجھنے میں دشواری ہوتی ہے، یا مسائل گنجلک رہ جاتے ہیں وہاں استاذ اس کی وضاحت کر دیتے ہیں۔

اس طریقہ سے سب سے بڑا فائدہ یہ ہوتا ہے کہ طلبہ کو کتاب حل کرنے اور پھر درس کی صورت میں پیش کرنے کی عادت ہو جاتی ہے، مختلف فنون کے اصل ماٰخذ و مصادر سے رجوع کرنے میں اس کی باریکیاں سمجھ میں آجاتی ہیں اور اس طرح تمام مسائل پر نظر بھی پڑ جاتی ہے، یہ طریقۂ درس قدیم زمانہ سے رائج ہے اور طلبہ کے لیے بڑا مفید ہے۔(۳۳)

عربی زبان وادب میں ندوے کا منہج

ادبِ عربی میں ندوے کا منہج ملک میں موجود تمام مدارس سے ممتاز اور نمایاں ہے، بلکہ حقیقت یہ ہے کہ عربی زبان وادب کو ایک زندہ اور حیات ونمو سے لبریز زبان کی حیثیت سے رائج اور متعارف کرانے کا سہرا بڑی حد تک ندوہ اور ابنائے ندوہ کے سر ہے، ندوے نے ادب کو صرف بقدر ضرورت پڑھنے اور سمجھنے پر ہی اکتفاء نہیں کیا بلکہ ادب میں ایک نئی روح پھونکی اور وسیع پیمانہ پر اس کے ذریعہ خدمات انجام دیں، اس کے لیے ایک الگ شعبہ "کلیۃ اللغۃ العربیۃ" کے نام سے قائم کیا، اسی طرح ندوۃ العلماء نے ہی سب سے پہلے ملکی سطح پر عربی جرائد ورسائل کو صحافت کی حیثیت سے پیش کیا۔

کاروانِ ادبِ اسلامی کے سرخیل حضرت مولانا سید ابو الحسن علی ندویؒ نے پوری دنیا کے اسلام پسند ادباء کو ایک پلیٹ فارم پر جمع کرنے کیلئے "عالمی رابطۂ ادبِ اسلامی" کی بنیاد ڈالی، جس نے آفاقیت کو اپنا نصب العین بنا کر اسلامی ادب سے عالم اِسلام کو روشناس کرایا اور تمام ادبی حلقوں میں اس کو متعارف کرایا۔ حضرت مولاناؒ نے ادب کو نہ صرف ایک نئی روشنی دی اور اسے زندہ وتابندہ بنایا، بلکہ ادبی اصناف میں قابل قدر اضافہ کیا اور ادبی اُفق کے مخفی گوشوں کو اجاگر کیا، مثلاً دعاء ومناجات کا ادب، مقدمہ وپیش لفظ کا ادب، سفر ناموں کا ادب، بچوں کا ادب، یہ ایسے ادبی خزانے ہیں، جو اس دور کے ادباء کی نظروں سے مخفی تھے، آپ نے ان اصناف سے پردۂ خلفاء کو ہٹایا اور اس نقطۂ نظر کو تطبیقی عمل سے مزین کر کے دنیائے ادب کے سامنے پیش کیا۔ ندوۃ العلماء نے عربی ادب کو اپنے نصاب میں خاص اہمیت دی، تقریباً ہر درجہ میں کتب عربی کا انتخاب کیا، جن میں اکثر کتب فضلاء ندوہ کی ہیں، جن کی مقبولیت ہندوستان میں ہی نہیں بلکہ عالم اسلام میں ہے۔ جیسے: قصص النبیین، القرأۃ الراشدۃ، مختارات، منثورات وغیرہ۔ ان کتابوں کی بڑی خوبی یہ ہے کہ ان کا ہر سبق فن اور عربی زبان کی صحیح اور ضروری رہنمائی کے ساتھ حشو زائد اور فلسفہ ومنطق کی آمیزش سے دور ہے اور عربی کو تقریر وتحریر کی زندہ زبان کی طرح برتنے کی اچھی استعداد پیدا کرتی ہیں، ان کی ایک اور قابل قدر لائق خصوصیت یہ ہے کہ اس عربی نصاب کی کتابیں اس نفسیاتی طریقے پر مرتب ہوئی ہیں، جس کے ذریعہ بچوں اور نوجوانوں میں اسلامی حمایت، دینی غیرت اور اعلیٰ اخلاق پروان چڑھتے ہیں اور دل ودماغ میں ایمان وعمل کے جذبات پرورش پاتے ہیں۔(۳۴)

ندوۃ العلماء کا مسلک

ندوۃ العلماء فکر ولی اللّٰہی کا شارح وترجمان ہے اور حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ کی فکر ہی ندوۃ العلماء کی بنیاد واساس ہے۔

مولانا سید ابو الحسن علی ندویؒ فرماتے ہیں:

"یہ دار العلوم ندوۃ العلماء (اور دوسرے صحیح الفکر والاعتقاد مدارس) ہندوستان کی دو عہد ساز شخصیتوں کے مدرسۂ فکر پر قائم ہوا ہے۔

ایک حضرت مجدد الف ثانی سرہندیؒ (م ۱۰۳۴ھ) دوسرے حضرت شاہ ولی اللہ دہلویؒ (م ۱۱۷۶ھ) یہ دو اس کے اصل بانی، اس کے روح رواں، اس کے رہبر اور معیار بھی ہیں اور اس فکر کی اشاعت اور جدوجہد کا بھی معیار ہیں"۔(۳۵)

ایک اور جگہ فرماتے ہیں: "ہم صاف کہتے ہیں کہ ہمارا مسلک وہی ہے جو شاہ ولی اللہؒ اور آپ کی اولاد و خلفاء کا تھا، سید احمد شہیدؒ کا تھا، اور جس پر علمائے دیوبند، حضرت مولانا قاسم صاحب نانوتویؒ، حضرت مولانا رشید احمد گنگوہیؒ اور حضرت مولانا اشرف علی تھانویؒ قائم تھے اور پھر آخر میں حضرت مدنی اور حضرت رائے پوریؒ اور حضرت شیخ الحدیثؒ جس پر تھے"۔(۳۶)

یہاں حضرت مولاناؒ کا وہ اقتباس پیش کرنا مناسب معلوم ہوتا ہے جس میں ندوے کی گویا پوری روح آگئی ہے:

- "دین وعقائد کے معاملہ میں ندوۃ العلماء کے مسلک کی بنیاد دین خالص پر ہے جو ہر قسم کی آمیزش وآلائش سے پاک ہے، تاویل اور تحریف سے بلند، ملاوٹ اور فریب کی دسترس سے دور اور ہر اعتبار سے مکمل اور محفوظ ہے۔
- دین کے فہم اور تشریح اور تعبیر میں اس کی بنیاد اسلام کی اولین اور صاف وشفاف سرچشموں سے استفادہ اور اس کی اصل کی طرف رجوع پر ہے۔
- اعمال واخلاق کے شعبہ میں دین کے جوہر ومغز کو اختیار کرنے، اس پر مضبوطی سے قائم رہنے، احکام شرعیہ پر عمل، حقیقتِ دین اور روحِ دین سے زیادہ قربت تقوی اور صلاح باطن پر ہے۔
- تصور تاریخ میں اس کی بنیاد اس پر ہے کہ اسلام کے ظہور اور عروج کا دور اول سب سے بہتر اور قابل احترام دور، اور وہ نسل جس نے آغوش نبوت ﷺ اور درس گاہ رسالت ﷺ میں تربیت پائی اور قرآن وایمان کے مدرسہ سے تیار ہو کر نکلی سب سے زیادہ مثالی اور قابل تقلید نسل ہے اور ہماری سعادت ونجات اور فلاح وکامرانی اس بات پر منحصر ہے کہ ہم زیادہ سے زیادہ اس سے استفادہ کریں اور اس کے نقش قدم پر چلنے کی کوشش کریں۔
- نظریۂ علم اور فلسفۂ تعلیم میں اس کی اساس اس پر ہے کہ علم بذات خود ایک اکائی ہے جو قدیم وجدید اور مشرق ومغرب کے خانوں میں تقسیم نہیں کی جاسکتی، اگر اس کی کوئی تقسیم ممکن ہے تو وہ تقسیم صحیح اور غلط، مفید اور مضر اور ذرائع اور مقاصد کے اعتبار سے ہوگی۔

استفادہ اور افادہ اور ترک وقبول کے شعبہ میں اس کا عمل اس حکیمانہ نبوی تعلیم پر ہے کہ "الحكمة ضالة المؤمن حيث وجدها فهو أحق بها" (حکمت مومن کا گمشدہ مال ہے جہاں بھی وہ اس کو پائے وہ اس کا مستحق ہے)، نیز قدیم حکیمانہ اسلوب: "خذ ما صفا ودع ما كدر" یعنی جو صاف ونظیف ہو اس کو لے لو اور جو آلودہ اور کثیف ہو اس کو چھوڑ دو۔

- اسلام کے دفاع اور عصر حاضر کی لادینی قوتوں کے مقابلہ میں اس کی اساس اس ارشاد ربانی پر ہے: "وأعدوا لهم ما استطعتم من قوة" [الأنفال:۶۰] یعنی ان کے مقابلہ کے لیے جتنی قوت تم سے ممکن ہو سکے تیاری کرو۔

دعوت الی اللہ، اسلام کے محاسن وفضائل کی تشریح اور ذہن وعقل کو اس کی حقانیت وصداقت پر مطمئن کرنے میں اس کا عمل اس حکیمانہ وصیت پر ہے کہ: "كلموا الناس على قدر عقولهم، أتريدون أن يكذب الله ورسوله" یعنی لوگوں سے ان کی عقلوں کا خیال رکھتے ہوئے گفتگو کرو، کیا تم چاہتے ہو کہ اللہ اور اس کے رسول ﷺ کو جھٹلا دیا جائے۔(۳۷)

ندوۃ العلماء کا فقہی مسلک

ندوۃ العلماء کے فقہی مسلک کی بنیاد حضرت شاہ ولی اللہ دہلویؒ کے مسلک پر قائم ہے، ان ہی کے اصول و نظریات پر ندوۃ العلماء کی فکری اساس قائم ہے۔

مولانا علی میاں ندویؒ ندوۃ العلماء کے مسلک کی وضاحت کرتے ہوئے تحریر فرماتے ہیں:

"عقائد و اصول میں وہ جمہور اہلِ سنت کے مسلک کی پابندی اور سلف کے آراء و تحقیقات کے دائرے میں محدود رہنا ضروری سمجھتا ہے، فروعی مسائل کے بارے میں اس کا مسلک و اصول یہ ہے کہ حتی الامکان اختلافی مسائل کو چھیڑنے اور ہر ایسے طرزِ عمل سے احتراز کیا جائے جس سے باہمی منافرت بڑھے اور امت کا شیرازہ منتشر ہو، سلفِ صالحین سے حسنِ ظنّ رکھا جائے اور ان کے لیے عذر تلاش کیا جائے، اسلام کی مصلحت اجتماعی کو ہر مصلحت پر ترجیح دی جائے"۔(۳۸)

سید الطائفہ علامہ سید سلیمان ندویؒ اپنا مسلک بیان کرتے ہوئے جو در اصل ندوہ کے اجتماعی مسلک کی ترجمانی ہے حضرت مولانا اشرف علی تھانویؒ کو ایک مکتوب میں تحریر فرماتے ہیں:

"فقہ میں متاخرین کا متبع نہیں، مگر اہلِ حدیث بالمعنی المتعارف نہیں، ائمہ رحمۃ اللہ علیہ کا دل سے ادب کرتا ہوں اور کسی رائے میں کلیتاً ان عدول حق نہیں سمجھتا"۔(۳۹)

اسی طرح تراجم اہلِ حدیث کے مقدمہ میں اپنا مسلک یوں بیان فرماتے ہیں:

"میں سنت کا پیرو اور توحیدِ خالص کا مقتدی ہوں، سنّت کو دلیل راہ مانتا ہوں اور علماء کے لیے اجتہاد کا دروازہ ہمیشہ کھلا جانتا ہوں اور حق کو ائمہ سلف میں سے کسی ایک میں منحصر نہیں جانتا"۔(۴۰)

اختلافی مسائل میں راہِ اعتدال

ندوۃ العلماء نے مسلمانوں کو جو سب سے بڑا درس دیا وہ اعتدال کا درس ہے، ندوۃ العلماء کے تمام کارناموں کو ایک طرف کر دیا جائے اور صرف اسی ایک خدمت کو لیا جائے تو یہی ندوۃ العلماء کے تعارف کے لیے کافی ہے، ان حالات میں جب کہ اختلاف و انتشار، تکفیر و تفسیق کا بازار گرم تھا، ندوے کے بانیوں نے اعتدال کی صدا لگائی، فروعی مسائل میں الجھنے کی بجائے مقاصد شریعت کی طرف توجہ دینے اور مسلمانوں کے بنیادی مسائل کو حل کرنے کے لیے کوشاں ہونے کا علما کو مشورہ دیا اور دین کے تقاضوں اور ملت کی ضرورت کی طرف ان کی توجہ مبذول کرائی۔

ندوۃ العلماء نے اعتدال اور وسعت قلبی کا جو نعرہ بلند کیا تھا، اس کا مطلب یہ نہیں تھا کہ تمام مسالک کو جمع کر کے ایک نیا مذہب بنایا جائے؛ بلکہ اس کا مقصد یہ تھا کہ مسلمانوں کے درمیان مسالک کے نام پر جو تفرقہ بازی ہو رہی ہے، اس کو ختم کیا جائے، دیگر مسالک و مکاتبِ فکر کے علما اور ان کی کتابوں سے علمی استفادہ کیا جائے اور مسالک کی باہمی عصبیت کو ختم کیا جائے اور اختلافی مسائل میں اعتدال کی راہ لی جائے۔

جدید عصری تقاضوں کی تکمیل کے لیے اجتہاد کی ضرورت اور ندوہ کا موقف

مولانا سید ابو الحسن علی حسنی ندویؒ اجتہاد کی اہمیت اور اس زمانہ میں اس کی ضرورت پر روشنی ڈالتے ہوئے لکھتے ہیں:

"اجتہاد اس زمانے کی حاجت اور دین کی ضرورت ہے جو زندگی کے قافلے کی رہ نمائی اور قیادت کرتا ہے۔ خصوصاً اس زمانے کی حاجت اور اس دین کی ضرورت ہے جو زندگی کے قافلے کی رہ نمائی اور قیادت کرتا ہے، خصوصاً اس زمانے میں اور بھی اس کی ضرورت ہے جب کہ تمدن اور

صنعت و تجارت نے ایسی غیر معمولی اور حیرت انگیز ترقی کرلی ہے، جس کا تصور بھی نہیں کیا جاسکتا تھا۔ جدید تجارتی معاملات اور معاہدوں میں ایسے فقہی احکامات اور فیصلوں کی ضرورت ہوتی ہے جو اسلامی فقہ کے اصولوں اور شریعت اسلامی کے مقاصد سے ہم آہنگ ہوں"۔(۴۱)

ندوۃ العلماء کا موقف یہی ہے کہ اجتہاد کا دروازہ ہمیشہ کے لیے کھلا ہے؛ لیکن اس کے حدود و قیود کو سامنے رکھتے ہوئے اصولِ فقہ کی کتابوں میں اس کے لیے جو شرائط بیان کی گئی ہیں ان کا لحاظ ضروری ہے۔

حرفِ آخر

اس تحریک نے اپنے تاسیس کے صرف چند ہی برسوں کے بعد ہی غیر منقسم ہندوستان اور برِ صغیر ہی میں نہیں؛ بلکہ عالمی سطح پر اپنی اہمیت و افادیت منوالی تھی اور اس کے نامور فضلا اور باکمال فارغین نے زبان و قلم، تقریر و تحریر، علم و ادب، فکر و فن اور عربی و اردو صحافت کی دنیا میں اپنی صلاحیتوں کا لوہا منوالیا تھا اور پوری قوم و ملت سے خراجِ تحسین حاصل کرلیا تھا۔

فارغینِ ندوہ نے ندوۃ العلماء کے ذریعہ مرتب کردہ جدید نصابِ درس و نظام تعلیم و تربیت کی بدولت وہ ذہنی استعداد اور فکری بلندی حاصل کرلی تھی کہ احساسِ مرعوبیت سے بالاتر ہو کر جدید تعلیم یافتہ طبقے کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بات کرسکتے تھے اور ہر زمانے کے فتنوں کا اپنی غزارتِ علم اور وسعتِ مطالعہ کے ذریعہ نہ صرف مقابلہ کرسکتے تھے؛ بلکہ ہر محاذ پر باطل افکار و خیالات کو شکستِ فاش سے دوچار کرسکتے تھے۔ الحاد و تشکیک و استشراق اور فتنہ دہریت و ارتداد کو انھوں نے اپنے بلوں میں پناہ لینے پر بارہا مجبور کیا اور اسلام کی حقانیت و برتری کو ثابت کیا۔

دار العلوم ندوۃ العلماء کو قائم ہوئے سوا سو برس ہوگئے، ندوہ آج بھی انہی اصولوں پر قائم ہے، جن پر ابتداء میں اس کی بنا رکھی گئی تھی، افراط و تفریط کے درمیان راہِ اعتدال اس کا شعار ہے، امت کے تمام طبقات میں ہم آہنگی پیدا کرنا اس کا مشن ہے، وہاں قدیم اور جدید دونوں علوم سے استفادہ پر زور دیا جاتا ہے۔ آج کے دور میں جب کہ انتشار و تفرقہ عام ہے، شدت پسندی اور غلو کا مظاہرہ کیا جاتا ہے، ندوہ حکمت کے ساتھ اپنے منہجِ اعتدال پر قائم ہے، آج بھی یہ ادارہ اپنے طلباء کی ایسے نہج پر تربیت کر رہا ہے کہ یہاں کے فارغین کو اعتدال و توازن اور قدیم و جدید کا جامع تصور کیا جاتا ہے، اور تمام حلقوں اور تمام طبقات میں ان پر اعتماد کیا جاتا ہے۔ ندوۃ العلماء کی اب بھی وہی معنویت ہے جیسے پہلے تھی۔

معروف قلم کار مولانا علاؤ الدین ندویؒ لکھتے ہیں: "مسلمانانِ ہند کی تاریخ میں ندوۃ العلماء کی بنیاد پڑی تو دار العلوم دیوبند اور مدرسۃ العلوم علی گڑھ پہلے سے موجود تھے، ان دونوں اداروں کی موجودگی میں ندوۃ العلماء کی ضرورت تھی اور جب تک ندوۃ العلماء کی بنیاد نہ پڑ جاتی اس وقت تک اسکی جگہ خالی رہتی۔ اوّل الذکر دونوں اداروں نے جن کاموں کا بیڑہ اٹھایا تھا وہ سر آنکھوں پر، ان دونوں ہی اداروں کی ضرورت و معنویت آج کے بعد کل کو دس گنا زیادہ بڑھ جائے، تب بھی ندوۃ العلماء جن مقاصد کو لے کر اٹھا تھا ان کی ضرورت ہمیشہ باقی رہے گی، ندوہ، دیوبند اور دوسرے دینی اداروں کی ضرورت تو اس وقت بھی باقی رہے گی، جب کوئی مسلمان خلافت راشدہ کے طرز کی حکومت قائم کرنے میں کامیاب ہو جائے؛ کیونکہ اس طرز کے اسلامی قلعے نہ ہوں گے تو خلافت کے جسم کو صاف شفاف اسلامی خون کہاں سے سپلائی کیا جاسکے گا؟(۴۲)

حواشی

(۱) تاریخ ندوۃ العلماء:۳۹،۳۸/۱

(۲) ایضا:۴۱،۴۰/۱

(۳) مسلم ممالک میں اسلامیت اور مغربیت کی کشمکش:۸۷

(۴) پیامِ ندوۃ العلماء:۴۱،۴۰/ سیرت محمد علی مونگیری:۷۶،۷۵

(۵) مسلم ممالک میں اسلامیت اور مغربیت کی کشمکش:۸۸،۸۷

(۶) ھندوستانی مسلمان—ایک تاریخی جائزہ:۱۳۳

(۷) سوانح قاسمی:۲۲۶/۲

(۸) ھندوستانی مسلمان—ایک تاریخی جائزہ:۱۳۳

(۹) حیاتِ شبلی:۲۴۱

(۱۰) مسلم ممالک میں اسلامیت اور مغربیت کی کشمکش:۹۳

(۱۱) پیامِ ندوۃ العلماء:۵۸،۵۷/ سیرت محمد علی مونگیری:۸۸،۸۷

(۱۲) چنانچہ وہ ذکر کرتے ہیں: ”آج صبح سے دوپہر تک قیام گاہ میں رہا، دوپہر کو کھانا کھا کر جامع مسجد نماز پڑھنے کے لئے گیا، نماز کے بعد چار جگہ وعظ ہونے لگا، منبر پر مولوی محمد اکبر وعظ کہتے ہیں، یہ بزرگ حنفیوں کا خوب مذاق اڑاتے ہیں دل کھول کر تبرا کرتے ہیں، اس بات پر فخر کرتے ہیں کہ ہدایہ پڑھانے سے توبہ کی ہے، دوسرے صاحب مئذنہ کے پاس اسی طور پر حنفیہ کا خاکہ اڑا رہے ہیں، تیسرے صاحب دوسری جانب محدثین و متبعین سب کی خبر لے رہے ہیں قیام تعظیمی کے منع کرنے پر سخت سست کہہ رہے ہیں، چوتھے صاحب حوض پر کچھ مناجاتیں اور غزلیں کہہ رہے ہیں اور لوگوں کو اپنی طرف راغب کر رہے ہی، الغرض ایک ہڑ بونگ تھا، جس کو دیکھ کر نہایت افسوس ہوا، خدا کی مرضی میں کسی کو دخل نہیں، جب سلطنت اسلام جاتی رہی، تو جس کا جو جی چاہے کہے اور کرے۔“ (دہلی اور اس کی اطراف:۶۳)

(۱۳) سیرتِ محمد علی مونگیری:۱۰۷،۱۰۹ (تلخیص)

(۱۴) مقالہ متعلقہ سوانح از: مولانا منت اللہ رحمانی:۳۱ بحوالہ سیرت محمد علی مونگیری:۱۰۹

(۱۵) حامیان ومتبعانِ ندوہ کے لیے مژدہ:۲ بحوالہ رودادِ چمن:۱۶،۱۵

(۱۶) مکاتیبِ شبلی:۱۵۳/۲

(۱۷) ۴۸ سال شفقتوں کے سایہ میں:۶۷/ تاریخِ ندوۃ العلماء:۵۶،۵۵/۱

(۱۸) تاریخ ندوۃ العلماء:۲۱۲

(۱۹) ایضاً:۲۱۸

(۲۰) شذراتِ شبلی:۶۴

(۲۱) تلخیص از: حیاتِ عبد الحیؒ:۱۴۶،۱۴۳

(۲۲)ھندوستان کا نصابِ درس اور اس کے تغیرات:۲۱،۲۰

(۲۳)نظامِ تعلیم وتربیت ــــ اندیشے، تقاضے اور حل:۸۲

(۲۴)خطباتِ شبلی:۲۶،۲۵

(۲۵)مقالاتِ شبلی:۱۳۵/۳

(۲۶)حیاتِ شبلی:۳۳۱

(۲۷)خطباتِ شبلی:۲۴،۲۳

(۲۸) یہاں یہ وضاحت ضروری ہے کہ انگریزی تعلیم کا مقصد یہ نہیں تھا کہ طلبہ مغربی تہذیب کے رنگ میں رنگ جائیں اور مغربی کلچر اختیار کرلیں۔ چنانچہ مولانا حبیب الرحمٰن شروانیؒ نے ندوۃ العلماء کے نویں اجلاس (جو اکتوبر ۱۹۰۲ء کو امرتسر میں منعقد ہوا) میں انگریزی تعلیم کے متعلق کہا:"انگریزی تعلیم کو ترقی دینا اس زمانہ میں ضروریاتِ قوی میں سے ہے، اس کے ساتھ یہ لحاظ رکھنا بھی ضروری ہے کہ تعلیم انگریزی کی رو میں مسلمان اپنا دین اور مذہب نہ کھو بیٹھیں بلکہ مسلمان، مسلمان رہ کر مغربی تعلیم وشائستگی میں ترقی کریں۔"(صدر یار جنگ:۱۵۰)

(۲۹)مستفاد از:حیاتِ شبلی، ص:۳۳۰تا۳۳۲/ ندوۃ العلماء کا فقہی مزاج اور ابنائے ندوہ کی فقہی خدمات:۷۶تا۷۷

(۳۰)نظامِ تعلیم وتربیت ــــ اندیشے، تقاضے اور حل:۱۰۳

(۳۱)ندوۃ العلماء ــــ ایک رہنما تعلیمی مرکز اور تحریکِ اصلاح ودعوت:۳۴،۳۳

(۳۲)ندوۃ العلماء ــــ ایک رہنما تعلیمی مرکز اور تحریکِ اصلاح ودعوت:۴۵،۴۴

(۳۳) تلخیص از:ندوۃ العلماء کا فقہی مزاج اور ابنائے ندوہ کی فقہی خدمات:۱۴۱تا۱۴۳

(۳۴)مستفاد از:ندوۃ العلماء کا فقہی مزاج اور ابنائے ندوہ کی فقہی خدمات:۱۰۵تا۱۰۶

(۳۵)خطباتِ مفکرِ اسلام:۵۵،۵۴/۳

(۳۶)مجالسِ حسنہ:۳۹۰

(۳۷)کاروانِ زندگی:۱۴۲،۱۴۱/۱

(۳۸)ندوۃ العلماء ــــ ایک دبستانِ فکر:۱۱

(۳۹)تذکرۂ سلیمان:۹۹

(۴۰)تراجم علمائے اھلِ حدیث اوّل (مقدمہ):۳۴بحوالہ ندوۃ العلماء کا فقہی مزاج اور ابنائے ندوہ کی فقہی خدمات:۱۲۸

(۴۱)اجتماعی اجتہاد:۲۰

(۴۲)ندوۃ العلماء کا فکری وملّی شعور (مقدمہ):۶

مراجع و مصادر

(۱) تاریخ ندوۃ العلماء، مولانا محمد اسحاق جلیس ندوی، مجلس صحافت و نشریات، لکھنؤ، ۲۰۱۷ء

(۲) مسلم ممالک میں اسلامیت اور مغربیت کی کشمکش، حضرت مولانا سید ابو الحسن علی حسنی ندویؒ، مجلس تحقیقات و نشریاتِ اسلام، لکھنؤ، طبع پنجم ۲۰۰۳ء

(۳) ہندوستانی مسلمان-ایک تاریخی جائزہ اور موجودہ صورت حال کی عکاسی، مولانا علی میاں ندوی، مجلس تحقیقات و نشریاتِ اسلام، بار سوم ۱۹۹۲ء

(۴) سوانح قاسمی، مناظر احسن گیلانی، مکتبہ رحمانیہ لاہور

(۵) حیاتِ شبلی، سید سلیمان ندویؒ، دار المصنفین اعظم گڑھ، ۲۰۰۸ء

(۶) دہلی اور اس کے اطراف، حکیم سید عبد الحئی، اردو اکادمی، دہلی، فروری ۱۹۸۸ء

(۷) سیرت محمد علی مونگیری، سید محمد الحسنیؒ مجلس صحافت و نشریاتِ اسلام، لکھنؤ، بارِ چہارم، مئی ۲۰۱۶ء

(۸) رودادِ چمن، سید محمد الحسنیؒ مجلس صحافت و نشریات اسلام، بارِ دوم، ۲۰۱۳ء

(۹) مکاتیبِ شبلی، مرتب سید سلیمان ندویؒ، دار المصنفین، ۲۰۱۲ء

(۱۰) ۴۸ر سال شفقتوں کے سایے میں، ڈاکٹر سعید الرحمٰن اعظمی ندوی، مکتبہ فردوس، لکھنؤ، ۲۰۱۲ء

(۱۱) صدر یار جنگ، شمس تبریز خان، ۲۰۱۱ء، مکتبۂ فردوس، لکھنؤ

(۱۲) ہندوستان کا مصابِ درس اور اس کے تغیرات، حکیم عبد الحئی، شعبۂ تعمیر و ترقی، دار العلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ، ۱۹۹۴ء

(۱۳) نظامِ تعلیم و تربیت ــــ اندیشے، تقاضے اور حل، واضح رشید حسنی ندوی، ترجمہ و ترتیب: محمد وثیق ندوی، دار الرشید لکھنؤ، ۲۰۱۳ء

(۱۴) ندوۃ العلماء ــــ ایک رہنما تعلیمی مرکز اور تحریک اصلاح و دعوت، واضح رشید حسنی ندوی، دفتر نظامت ندوۃ العلماء، لکھنؤ، ۲۰۰۹ء

(۱۵) کاروانِ زندگی، ابو الحسن علی ندوی، مکتبۂ اسلام لکھنؤ، بارِ سوم ۲۰۰۰ء

(۱۶) ندوۃ العلماء ــــ ایک دبستانِ فکر، ایک رہنما تعلیمی تحریک، از: ابو الحسن علی ندوی، واضح رشید حسنی ندوی، ترجمہ از عربی: شمس تبریز خان، پوسٹ بکس، ٹیگور مارگ ندوۃ العلماء، لکھنؤ۔

(۱۷) مقالاتِ شبلی، علامہ شبلی نعمانی، دار المصنفین، ۲۰۰۹ء

(۱۸) تذکرۂ سلیمان، غلام محمد، ادارۂ نشر المعارف، طبع ثانی ۱۹۸۴ء

(۱۹) اجتماعی اجتہاد، ابو الحسن علی ندوی، اسلامک فقہ اکیڈمی، انڈیا، اکتوبر، ۱۹۹۹ء

(۲۰) خطباتِ مفکر اسلام، محمد کاظم ندوی، مکتبہ ایوب کاکوری، لکھنؤ، جنوری ۲۰۰۰ء

(۲۱) پیامِ ندوۃ العلماء، محمد الحسنی، دفتر اجلاس ندوۃ العلماء، لکھنؤ، بارِ اوّل ــــ ۱۹۷۵ء

(۲۲) شذراتِ شبلی، مرتبہ: ڈاکٹر محمد الیاس اعظمی، دار المصنفین اعظم گڑھ، طبعِ اوّل نومبر ۲۰۱۴ء

(۲۳) خطباتِ شبلی، مرتبہ: علامہ سید سلیمان ندوی، دار المصنفین، طبعِ جدید ۲۰۰۸ء

(۲۴) حیاتِ عبد الحیؒ، ابوالحسن علی ندوی، اردو مراٹھی پبلی کیشنز، بارِ دوم نومبر ۱۹۸۸ء

(۲۵) ندوۃ العلماء کا فقہی مزاج اور ابنائے ندوہ کی فقہی خدمات، منور سلطان ندوی، علامہ سید سلیمان ندوی اکیڈمی - لکھنؤ، طبع دوم، جولائی ۲۰۰۵ء

(۲۶) مجالسِ حسنہ، مرتبہ: فیصل احمد ندوی، ادارۂ احیائے علم ودعوت — لکھنؤ، جمادی الاضحی ۱۴۳۲ھ — مئی ۲۰۱۱ء

(۲۷) ندوۃ العلماء کا فکری وملی شعور، ڈاکٹر محمد طارق ایوبی ندوی، پاریکھ بک ڈپو، لکھنؤ، طبع دوم مئی ۲۰۱۸ء